کندن ایک پریم کتھا

کومل ذیشان

نوٹ: کندن پاک سوسائٹی کے لیے لکھی گئی خصوصی تحریر ہے۔

دوسرا حصہ

اس کے والد ایک ماہر غوطہ خور اور تیراک تھے، اپنے قبیلے میں سب سے زیادہ ہنر مند۔ ان دنوں وہ ان سے تیراکی سیکھ رہا تھا جب ایک دن وہ موتی کی تلاش میں گئے تو واپس نہیں آئے وہ اسی داو (لکڑی سے بنی مستعولی کشتی) پر تھا یکدم ہاہا کار مچ گئی تھی۔ ان کے ساتھ غوطہ لگانے والے واپس اوپر پہنچ گئے تھے، ایک دو زخمی ہوئے تھے وہ کہہ رہے تھے وہ شارک کا تر نوالہ بنے ہیں۔ وہ ایک کونے میں گھس گیا تھا گھر پہنچتے تک مسلسل اس کو جھٹکے لگتے رہے۔

مگر عجیب بات یہ تھی کہ اس واقعے نے اسے خوفزدہ نہیں کیا تھا۔ باپ کا چہرا نگاہ سے ہٹتا نہیں تھا اور باپ کو سمندر سے عشق تھا اس کے لیے تیراکی، موتی ڈھونڈنا، مچھلی پکڑنا کسی عبادت سے کم نہیں تھا۔ وہ ان سب کاموں کو عبادت کے سے خلوص کے ساتھ انجام دیتا تھا۔ اسے سمندر کا نشہ تھا اور یہ تربیت اور اثر اسے سمندر سے زیادہ دن دور نہیں رکھ سکا تھا۔ اگرچہ جھٹکے اسے اب بھی کبھی لگتے تھے۔

اور موتی تلاش کرتے کرتے ایک دن وہ تاجر کے روپ میں سرزمین ہند جانے والے بحری بیڑے میں سوار ہوا تھا۔ وہ جس امیر کے بحری بیڑے میں موتی نکالنے کا کام کرتا تھا اس نے اسے بھیجا تھا۔ اس بار اس نے اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کی افزائش بغداد میں کروائی تھی، اس کے علاوہ موتی کی کھیپ بھی زیادہ تھی سو اپنے ایک چچا کے بیٹے خالد افسے اور دو خادموں کے ساتھ اسے سرزمین ہند بھیجا تھا۔ یہ اس کا کردار تھا، عادات اور اخلاق جس کی وجہ سے اس پر ہر کوئی بھروسہ کرتا

تھا۔سب جانتے تھے وہ کبھی دغا نہیں دے گا، قول کی حفاظت کرے گا اور امانت کو ذمہ داری کے ساتھ سنبھالے گا۔

وہ ناواقف تھا ایسی سرزمین سے جہاں جنگل اور دریا تھے۔اس نے اس سے پہلے کبھی دریا نہیں دیکھا تھا۔جہاں کنول، گیندا اور تلسی کھلتے تھے۔۔۔وہ تو ایسے پھولوں سے ان کی خوشبو سے ناواقف تھا۔جہاں مانگ میں سندور بھرا جاتا تھا اور وہ حیرت سے ان سرخ کم کم زدہ مانگوں کو دیکھتا تھا۔جہاں سرسوتی تھی، رادھا تھی اور مینکا رقص کرتی تھی۔

جہاں ہلدی، صندل، مہندی، گل موہر کے پتوں، جیکارندا، چائے کی خشک پتیوں اور آملے سے زرد، سبز، نیلا، بھورا اور سیاہ رنگ بنا کر مصوری کی جاتی تھی۔۔۔ہولی کھیلی جاتی تھی۔

مگر اس سرزمین سے نسبت تو تھی اس کی اور یہ نسبت سمندر تھا۔یہ وہ سرزمین تھی جہاں قدیم وقتوں سے بحری جہاز تعمیر کیے جا رہے تھے۔۔۔ہزاروں سال پہلے سے۔۔۔ اور سمندری راستوں کے علم اور مون سون کی ہواؤں کے علم کے ذریعے یہاں کے باسی دنیا کے دور دراز کونوں تک سفر کرتے رہے تھے۔قدیم رگ ویدا میں ذکر ہے کہ یہاں سے تجارتی بحری بیڑے سمندروں میں چلتے تھے۔ورونا وہ دیوتا ہے جس کے پاس سمندری راستوں کا سارا علم تھا۔ہڑپہ اور موئنجو داڑو جیسی تہذیبیں وجود میں آنے کے بعد ہند کے تجارتی تعلقات مصر، سُمیر اور کریٹ سے پیدا ہوئے۔لوتھل اس وقت کی سب سے بڑی بندرگاہ گجرات میں پینتالیس سو سال قبل مسیح موجود تھی۔۔۔یہاں مغربی ایشیا اور افریقہ سے بحری بیڑے آکر لنگر انداز ہوا کرتے تھے جہاں کا عظیم جہازی گودام اینٹوں سے تعمیر کیا گیا تھا۔

اور جب تم ان ہزاروں برس قدیم ساحلوں پر جاتے ہو تو کیا تمہیں وہ تاجر دکھتے ہیں جن کے الگ الگ گروہ تھے اور ہر گروہ کے تاجروں کی انگلیوں میں پتھر، ہاتھی دانت یا کانسی سے بنیں مہر

زدہ انگوٹھیاں ہوا کرتی تھیں ۔وہ ہاتھوں میں علم لیکر چلتے تھے، جہاں روشنی کے مینارے تعمیر کیے جاتے تھے تاکہ بحری بیڑوں کو راہ ملے اور بعض اوقات تاڑ کے درخت پر مشعل روشن کر کے یہ کام لیا جاتا تھاتب جب سونے، چاندی اور پیتل کے سِکے چلتے تھے اور اس وقت روپا درسا کا جوان سِکوں کے خالص ہونے کی جانچ کرتا تھا۔۔۔ہزاروں برس پہلے۔ معیشت کے فروغ کے لیے مشرق سے مغرب، شمال سے جنوب تک سڑکیں تعمیر کی گئی تھیں ان سڑکوں پر سنگ میل کے نشان تھے اور شجر خود لگائے گئے تھے۔موریہ سلطنت میں ایک سڑک سولہ سو کلومیٹر طویل بنائی گئی جو اس وقت کے دارلخلافہ پاٹلی پتر (پٹنہ) کو ٹیکسلا اور شمال مغربی سرحد سے ملاتی تھی۔

جس سرزمین پر مزیرئس بندرگاہ تھی دو ہزار سال قبل۔ آشوری، فارسی، یونانی، فونیشیائی(جنوبی شام میں رہنے والی سامی قوم) جہاں اپنے بحری بیڑوں کے سنگ لنگر انداز ہوتے تھے۔قیمتی، پتھر، ہیرے، ہاتھی کے دانت ،موتی، سفید مصالحے اور کالی مرچیں ملکوں ملکوں بھیجی جاتی تھیں۔

اور جہاں جب بحری بیڑے ٹھہرتے تو ان میں کپڑا، شراب، گندم اور سونے کے سِکے ، مچھلی مسالہ اور زیتون کا تیل ہوتے۔ کیرلا میں واقع اس بندرگاہ کو ایک سونامی نے تباہ کیا۔اس جگہ کبھی مسلمان، یہودی اور یونانیوں کا اکٹھ ہوتا تھا۔

وہ سرزمین جس کا قدیم ویدوں میں شام سے تجارت کا ذکر ہے قریباً چودہ سو سال قبل مسیح ۔آٹھ سو سال قبل مسیح جب سلیمانؑ کا دور حکومت تھا، حیرام جو کہ صور کا بادشاہ تھا اس نے بحری بیڑہ مشرق کی طرف بھیجا جو ہند کے مغربی ساحل پر لنگر انداز ہوا۔ وہ اس سرزمین سے سونا، ، چاندی، ہاتھی دانت، بندر، مور، سرخ صندل کا درخت، زیورات اور قیمتی پتھر لے کر گئے۔

جس سرزمین پر پُوم پوہار بندرگاہ تھی دریائے کاویری کے کنارے جو تین سو سال قبل مسیح

میں طوفان کی زد میں آ کر تباہ ہوئی ۔ بھاروچ بندر گاہ دریا نرمدا پر جہاں عرب رومی اور مصری بیڑے پہنچتے تھے۔۔۔یہ فرعون کا دور تھا۔یہاں سے کپڑا اور مصالحے بھیجے جاتے۔پھر واسکوڈی گاما کے یہاں پہنچنے سے مشرق مغرب کے راستے کھل گئے ۔ مستقبل میں یہاں سامان اٹھانے والی قدیم کرینیں، گودام اور سمندری پل کے خرابات ظاہر ہونے والے تھے۔

اس سرزمین کی طرف سعد الکلندری محو سفر تھا یہ سولہویں صدی کے دھارے تھے۔اس وقت سمندر پر جوش تھا، لہریں عرشے تک اٹھتی آتی تھیں۔لالٹین کی روشنی جہاز کی اوپر والی نوک سے لرزتی چمکتی بحری جہاز پر دور تک پھیلتی، سمٹتی تھی ۔وہ عرشے پر کھڑا لہروں پر مستقبل کے بنتے بگڑتے مستقبل کے خدوخال دیکھ رہا تھا سمندر کا نمک اس کے منہ اور بالوں میں بھر رہا تھا۔



وہ عجیب سے مختصر خوشبودار لمحے تھے جن کو وہ اس کے ساتھ جی رہا تھا ۔دائیں طرف کنول نما فوارے تھے جن سے ندی بہتی دور تک جاتی تھی، گھنے پودے اور کنگی پام اور خوش رو گھاس اور بائیں طرف سبز وسیع قطعے اور ایک عمارت جو کہ زیر تعمیر تھی۔

سامنے میوزکل فاؤنٹینز تھے۔ جو عرب کی قدیم موسیقی میں آسمان چھوتے، گھومتے، بکھرتے وجدِ رقص میں تھے۔

"یہ نشان ؟" اس نے میوزک بند ہونے کے بعد اس سے پوچھا تھا۔وہاں اس کے بازو پر پانچ نیلے نقطے تھے ڈبلیو کی صورت۔اس نے پہلی مرتبہ دیکھے تھے۔

"پیدائشی ہیں۔"

"یہ آسمان پر تاروں کے ایک جھرمٹ سے مشابہ ہیں۔۔۔ہیں نا؟"اس نے ان پر غور کرتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"ہاں ہیں Cassiopeia عربی میں اسے ذات الکرسی کہتے ہیں۔"

"تمہیں یہ ہمارے کسی جوتشی کو دکھانا چاہیے۔وہ ضرور کوئی بھوشوانی کرے گا۔"

"کیا کہا ہے تم نے ؟" عمر کو کچھ نہیں سمجھ آیا تھا ہنسی ضرور آئی تھی۔وہ روانی میں انگریزی کے بجائے ہندی بول گئی تھی۔

"کچھ نہیں۔"کافی کی مہک اس کے اڑتے بالوں میں رچتی تھی۔آج یہاں شہید پارک میں کافی اینڈ بک فیسٹیول تھا۔

"میں سوچ رہا ہوں تمہیں باقاعدہ پروپوز کروں۔"

وہ ہنس دی تھی۔اسے برا لگا تھا۔

"میں مشرک تم موحد۔"

"اور بلکہ میں یہ رسک کیوں لوں تمہارے مذہب میں تو چار کی اجازت ہے۔"

"ہاں محبتیں چار تو جائز ہیں۔" وہ ہنسا تھا۔

"بلکہ اس سے زیادہ بھی جائز ہیں۔" وہ نفی میں سر ہلاتے ترس کھانے والا تاثر دیتی پانی میں بنتے سورج کا عکس دیکھنے لگی۔

"مگر عشق میں شرک نہیں ہوتا۔" کندن کے اندر ایک بڑا سا نمکین گھونٹ اترا۔

"تو تم خدا سے عشق کرتے ہو۔" وہ نہیں جانتی تھی اس نے یہ سوال اس سے کیوں کیا تھا۔

"پتا نہیں کوشش کرتے ہیں۔" وہ آنکھوں میں ابھر آئی نمی چھپا نہیں پایا۔

"مجھے تو لگا تھا ہم سب ساتھ میں آئے ہیں مگر اب لگ رہا ہے ساتھ میں بس تم دونوں آئے ہو۔" سپائکس بنائے ٹائٹ جینز میں کانوں میں مندری ڈالے کندن کو وہ مکی ماؤس لگا تھا وہ دور سے انہیں پکار رہا تھا عمر کا کافی اچھا دوست تھا۔

یہ جدید کویت جو خلیج فارس کی نوک پر لمبے ساحلی علاقے کے ساتھ تھا۔۔۔جہاں سات ہزار سال قبل پہلا موتی دریافت ہوا تھا اور جس نے دو جنگوں کے کٹھن زمانے دیکھے تھے اس میں ملتی دو روحوں کی کہانی ہے۔ آدم جب حوا سے ملے ہوں گے تو ان کی آنکھوں میں نمی اتری ہو گی، انہوں نے انہیں پکارا ہو گا دور سے۔۔۔

اور جب آج سے سات ہزار سال پہلے وہ سمندر کی تہہ میں اترا تو پتا نہیں اسے کیوں لگا کہ اس کے بازو پر کھدا نکشتر چمکتا ہے اور ادھر وہیں روشنی میں اس نے کچھ رنگین پرندے دیکھے، ایک کنول کا پھول جو شاہ بلوط کے قریب اک جوہڑ میں کچھ دِیوں کی روشنی میں دہکتا تھا اور پھر اس عکس کے پار اسے ایک عجب سا خوبصورت سیپ نظر آیا۔وہ آگے بڑھا اور دھیرے سے چھوا۔۔۔وہ کھل گیا۔اس کے اندر موتی تھا۔۔۔ گلاب رنگ ملائم اس کے بازو کے نکشتر کی طرح دمکتا۔پھر اس نے دیکھا یہاں تو پوری موتیوں کی کھیتی ہے۔

اور اس وقت اس جدید کویت میں جو خلیج فارس کی نوک پر ہے وہ دونوں الشہید پارک میں کھڑے ہیں جو اس سبز بیلٹ کا حصہ ہے جس کی تحریک قدیم کویت میں شروع کی گئی تھی۔ شہید پارک کے علاوہ بولیوارڈ بھی اسی تحریک کا حصہ تھا۔یہ اقدامات دیوان امیری یعنی شاہی خاندان کے ماتحتی میں عمل میں لائے جا رہے تھے۔ امیری دیوان کے ساتھ لوتھن یوتھ اچیومنٹ سنٹر نے اس کا ذمہ اٹھایا تھا ۔فن، ثقافت، تاریخ، پریم اور جل ان جگہوں پر امڈتا آتا تھا۔جہاں سبزے میں کتابوں کی اور کافی کی، پھولوں کی اور پانی کی خوشبو عجب سا نشہ دیتی تھی۔ یہاں اسی پارک میں ملک کے لیے شہید ہونے والوں کو خراج تحسین پیش کرنے کے لیے شیشوں سے یادگار تعمیر کی گئی تھی۔

اور یہ یادگار شیشوں سے کیوں بنائی گئی تھی۔۔۔یہ اس مٹی سے شیشہ تیار کیا گیا ہے جس کی چمک اور شفافیت کے اور مضبوطی کے سب گواہ ہیں اس شہید کی طرح جس کا کردار اور لفظ اور ارادہ اس

میں دکھتا ہے، یہ شیشوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں سے بنایا گیا ہے جو آسمان کی طرف بلند ہوتا ہے جس میں سب اپنا عکس دیکھتے ہیں کہ ہم تمہاری جگہ ہوتے تو یہ ہی کرتے یہی کریں گے اور ہم لاتعداد ہیں جو روشنیاں منعکس کرتے ہیں۔

اور وہ وہاں ملے تھے۔۔۔ کیوں ملے تھے۔۔۔ کیونکہ ملنا ضروری تھا۔

اور وہاں ایک شجر تھا جسے چاندی کے پرندوں نے تخلیق کیا تھا اور ریڈنگ روم ، گفٹ شاپ اور بک شاپ تھی۔ ایک تھیٹر جس کے باہر سنہرے تنے بکھرے تھے۔ یہ مصنوعی تھے اور بیٹھنے کے لیے بنائے گئے تھے۔

اور وہ تالاب جس کے کناروں پر سرکنڈے اگے تھے، زرد گھنٹیاں شاخوں پر کھلی تھیں اور وہ سرخ روش پر چلتے تھے۔ پھولوں سے رنگ آنکھوں میں عکس ہوتے تھے۔ دو ٹریکس پارک کے اندر چلتے تھے واکنگ اور جاگنگ ٹریک۔ جاگنگ یا ایکسر سائز ٹریک پر لوگ عجیب عجیب مضحقہ خیز حرکات و سکنات یعنی مشقیں کرتے نظر آتے۔ چلنے والا راستہ کہیں درختوں کے جھنڈ کے اندر بھی لے جاتا تھا اور وہاں سے قدم زمینوں پر رکھ دو تو وہاں درختوں کے سایوں میں جہاں کی سبز ٹھنڈک روح میں اترتی تھی، نمی کے باعث پاؤں میں گلتے پتے اور گیلی مٹی چپکتی تھی۔

جود کو نماز پڑھنی تھی وہ اس کو اپنے ساتھ لے جانے آئی تھی۔

"یہ سکارف لے لو اور میرے ساتھ چلو۔"

"مگر کسی کو شک پڑ گیا تو۔۔۔" وہ ڈر گئی تھی۔

"اٹس اوکے، میں ہوں نا۔"

"مگر۔۔۔" وہ اسے کھینچ کر مسجد کے اندر لے آئی تھی۔

یہ کیسی جگہ تھی وہ ساکت ہو گئی تھی۔

سامنے ٹرانسپیرنٹ شیشے کی دیوار تھی اور اس کے دوسری طرف سرمئی پتھر اک دوجے کے اوپر رکھے تھے اور ان کو لوہے کی جالی سے قید کر کے دیوار بنائی گئی تھی۔ یہ کیسی خوشبو تھی جو اس کے اندر سے گزری تھی محبوب کے مذہب کی خوشبو۔۔۔ اسے لگا ایک پل کو لگا وہ انار کلی ہو اور دیوار میں چنی جا رہی ہو۔ مگر اسے تو چنا جانا اچھا لگ رہا تھا۔۔۔ سکون آ رہا تھا۔ وہ ایک کونے میں جا بیٹھی۔

مسجد کے بالکل سامنے کتابوں کے سٹال پر وہ کھڑا تھا اس کو باہر نکلتے دیکھ کر چونکا۔

"یہ پردہ خوبصورت ہے۔" آنکھیں روشن ہوئی تھیں۔

"ہاں یہ پردہ خوبصورت ہے۔۔۔ تاکہ وہ ستائی نہ جائیں۔" جو د نے سامنے پڑے میز پر سے کنافے کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے لقمہ دیا۔

"اور مزے کی بات یہ ہے کہ اب پردے میں صرف مسلمان ہی تنگ کرتے ہیں پردہ دیکھ کر نان مسلمز رک جاتے ہیں۔" ایک اور کلاس فیلو نے لقمہ دیا تھا۔

"پہچان جو جاتے ہیں۔۔۔ مسلمان نہیں پہچان پاتے۔" جو د کہتے ہوئے کتابیں دیکھنے لگی تھی۔

سب مل کر اس حصے میں آئے تھے جہاں اٹھارہویں صدی کے کویت کا مینی اسچر تھا۔ مصنوعی جھیل میں تین لکڑی کی کشتیاں عربی میں جنہیں داو کہتے ہیں تیرتی تھیں، ایک شہر کی فصیل تھی ان میں دروازے نصب تھے، اندر مٹی سے بنی سرکاری عمارتیں اور گھر، سرخ قلعہ، ہسپتال اور محل اور سوق المبارکیہ یہ پرانا بازار تھا۔ ماڈل کے طور پر کویت کی جدید عمارتیں، مینار، پانی کی ٹینکیاں اور قدیم دور کا قلعہ بھی تعمیر کیا گیا تھا لیکن یہ س بڑے حجم میں تھا۔

وہ قلعے کا قدیم دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے تھے۔ لکڑی کی شہتیروں سے بنی چھت اور کھڑکی وہ گم صم ہوئی تھی۔ اس کھڑکی سے روشنی چھنکتی آتی تھی۔ وہ وہاں بر آمدوں کے لکڑی کے ستون اور دیواروں کو انہیں چھو کر محسوس کرتی تھی۔ اسے ایسے لگا اسے یہاں آنا تھا یہاں۔۔۔ یہ طے

تھا۔۔۔یہ جو ہو رہا تھا یہ یونہی ہونا تھا۔



چاندنی نے جو ایک آنسو سے قطرے کو ہوا میں معلق دیکھا اس کو اس پر ترس آیا چاند کی اجازت کے بنا ہی اس نے اس قطرے کو روشن کر دیا۔ قطرہ روشنی کے وزن کی تاب نہ لا سکا تھا۔۔۔وہ گرنے لگا اس سے پہلے کہ وہ ہوا میں خود کو روک لیتا اور اگلے دن کی سورج کی کرن اسے اپنے اندر سمو لیتی۔۔۔سمندر کی اتھاگہرائیوں میں موجود اس صدف کی محبت نے کشش ثقل کی مانند اسے اپنی اور کھینچا۔ اب وہ محبت کی تاب نہ لا سکا گرتا چلا گیا اور صدف میں دھیرے سے داخل ہوا۔ صدیوں اس نے اسے اپنے اندر چھپائے رکھا اور پھر جب اسے کائنات کے سب سے خوبصورت ترین موتی کا حصہ کر دیا تو اسے الہام ہوا اور اس نے اپنے محبوب سے کہا کہ میرے محبوب تم مجھے وہ موتی لا کر دو جو صدیوں سے سمندر کے تہہ میں پڑا ہے۔۔۔مجھے سنگھار کرنا ہے۔

اور جب سلمان المیری، ابن العربی، ہند، حامد اردن وقت کے مشہور گلوکار اور موسیقار باری باری عرب کی قدیم جدید، بلیوز اور جیز اور جانے کون کون سے ساز اور سر اور گیتوں سے فضا میں جادو بکھیرتے تھے، جو فرانس سے آئے ایک مصور پاسکل ہرنیول کو مدہوش کرتے تھے جو بچوں کی پینٹنگ کی لائیو ورکشاپ میں آیا تھا۔ اس وقت وہ دائیں طرف سٹیج پر سنائی جانے والی اس کتھا میں کھو گئی تھی۔۔۔ آواز اور کہانی کے زیر و بم میں۔ اس کے اندر شدت سے اس گلاب رنگ موتی کو دیکھنے کی خواہش جاگی تھی۔

وہ شبنم کا قطرہ تھا جو ہوا میں ٹھہرا ہوا تھا۔۔۔نصیب میں کیا لکھا ہے۔۔۔نصیب میں کیا لکھا ہوتا ہے۔ مٹی میں مل جانا، سمندر برد ہو کر سمندر ہو جانا یا پھر۔۔۔

ایسکیلیٹر سے نیچے اتر کر پارکنگ میں سب داخل ہوئے تھے۔ کنسرٹ کے بعد اکٹھے ہی سب گھر

جانے کے لیے نکلے تھے۔اس پارک کی پارکنگ بھی ذوق کا اعلیٰ نمونہ تھی ۔جہاں خوشبو دار آبشاریں گرتی تھیں اور درختوں کے ساحر تنے تھے ہر قطعے میں چھوڑی گئی خالی جگہ سے آسمان کی طرف اٹھتے تھے۔وہ دونوں ایسے ساتھ چل رہے تھے گویا "پینجرز" کی اٹھاسی سالہ تنہائی میں قید ہو گئے ہوں اور اب بس وہی دونوں ہوں عمر بھر کوئی اور نہیں ہو گا حالانکہ اس وقت وہ کلاس فیلوز کے ہجوم میں چلتے تھے۔

وہاں اس وقت مغلیہ دور تھا، سولہویں صدی سن پندرہ سوستانوے ، بادشاہ اکبر کی حکومت۔ وہ کل پچاس گھوڑے لیکر آیا تھا اور تین موتیوں سے بھری ٹوکریاں۔مغلیہ سلطنت کی طاقت اور سیاست دونوں کا انحصار گھوڑوں پر تھا۔ہند میں گھوڑوں کی افزائش کچھ مخصوص علاقوں میں کی جاتی تھی مگر ان کی خوراک اور آب وہوا اس پائے کی نہ ہونے کی وجہ سے وہ عربی، فارسی اور ترکی گھوڑوں کے معیار تک نہیں پہنچ سکتے تھے۔سو عرب، ترکستان، تزکستان، ایران سے آئے یہ گھوڑے مہنگے داموں یہاں بکتے تھے۔بحری راستوں سے عربی اور فارسی النسل گھوڑے درآمد کیے جاتے اور برّی راستوں سے ترکی اور تزکی۔

سورت ،گوا ،مٹا ، کچھ،کیمبے اس وقت کی بڑی بندرگاہیں تھیں جہاں یہ گھوڑے اتارے جاتے۔ ترک گھوڑوں کے علاوہ تہران، کشمیر ، تبت سے بھی اعلی نسل کے گھوڑے منگوائے جاتے تھے۔

اس کا سر سجدے میں تھا جب اعلان ہوا تھا کہ کچھ دیر میں جہاز ہند کے ساحل پر لنگرانداز ہو گا۔

سورت جہاں سعد کو اترنا تھا یہ کیمبے کے بعد ایک اہم بندر گاہ تھی۔

وہ سوریا پور آیا تھا سورج کے شہر جہاں کرشنا نے دوارکا جاتے وشرام کیا تھا۔

سلام پھیر کر وہ اندر کمرے میں داخل ہوا تاکہ سامان سمیٹ سکے۔

کمرے میں لکڑی، نمک اور پانی کی مہک رچی تھی۔ خالد افسے کسی دھیان میں کھویا حقہ پیتا تھا۔

"وہ سامنے میرا سامان بھی باندھو۔" رعب بھرے لہجے میں اسے حکم دیا تھا۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

سفر کی شروعات سے سعد شدید اضطراب میں تھا۔ خالد افسے کا رویہ اس کے ساتھ ہتک آمیز تھا اور بات اتنی نہ تھی اسے لگ رہا تھا وہ اسے ساتھ لیکر نہیں آنا چاہتا تھا۔ وہاں بھی اس نے حیلہ کر کے اسے واپس موڑنا چاہا تھا مگر وہ نہیں مانا تھا۔ وہ کسی بھی صورت امیر سے وعدہ خلافی نہیں کر سکتا تھا۔ باقی دو خادموں کا وجود تو نہ ہونے کے برابر تھا۔ کھانا دو تو کھا لیتے، بیٹھنے کا کہو تو بیٹھے ہی رہتے، کام کا کہو تو بغیر کوئی سوال کیے خاموشی سے سر جھکائے کام میں جت جاتے۔ چہروں پر غلامانہ سنجیدگی بات کرتے تو صرف آپس میں کھسر پھسر۔

آسمانوں نے میگھ راگ چھیڑ رکھا تھا، کرشنا کی نیلی انگلیاں وینا کی تاروں پر تھیں اور مور رقص میں تھے۔

سورت سے بیس کلومیٹر دور بحیرہ عرب کے ساحل پر بحری بیڑہ لنگر انداز ہوا تھا۔ جس وقت سورج اپنا مکھ چھپاتا تھا ۔وہ چاروں لکڑی کی نم گلتی سیڑھیوں پر قدم جماتے اترے تھے۔ وہاں اس وقت پندرہ بیس کی تعداد میں بحری بیڑے لنگر انداز تھے اور سامانِ تجارت اتارا جا رہا تھا۔

"وہاں سامنے سورت اور کیمبے کا متصدی (گورنر) کھڑا ہے۔" ساتھی مسافروں میں سے کسی نے کہا تھا۔

سعد نے دیکھا سر پر دھانی پگڑی، سبز چوغہ، دھانی پٹکا اور پاجامہ اٹھتا ہوا قد بھوری داڑھی، چہرا پر تمکنت تھا نیدار جو ساحلی علاقے کی گشت پر نکلا ہوا تھا اسے دیکھ کر ٹھہر گیا تھا وہ اس وقت افریقہ سے آئے کچھ بڑے تاجروں سے محو گفتگو تھا۔

جو بندر گاہیں دریا کے ذریعے سمندر سے ملتی تھیں ان کو باڑا کہتے تھے اور یہ دوسری کسی بندر گاہ کے ماتحت آتی تھیں۔ وہاں کا متصدی اکثر دوسرے بہت سے عہدوں کا مالک ہوتا۔ سورت کو بحیرہ عرب کے پانی براہ راست نہیں چھوتے تھے۔ یہ شہر دریا ٹاپٹی کے کنارے پر تھا جو بیس کلومیٹر کے بعد بحیرہ عرب میں گرتا تھا۔

بحری جہاز سے گھوڑے اتراوا کر وہ چاروں زمینی راستے سے آئے تھے۔ ابھی کچھ دیر پہلے بارش تھمی تھی مٹی کی سگھند، ہریاول پر ٹھہری بوندیں، کنووں کے پانی کی مہک، جانوروں کی آوازیں اور چیدہ چیدہ مسافروں کے ہاتھوں میں جلتے چراغ جنہیں لیے وہ شہر کے دروازے کی طرف بڑھتے تھے۔ وہاں دروازے پر سپاہی موجود تھا جو سب داخل ہونے والوں اور باہر نکلنے والوں پر نگاہ رکھتا تھا۔ کچھ بیل گاڑیوں پر لدے سامان اور گھوڑوں کے ساتھ پیادہ اور کچھ سوار شہر میں داخل ہوئے تھے۔ خالد افسے ماتھے پر ہلکے بل لیے چلتا تھا اس کا سامان بیل گاڑی پر لدا تھا جبکہ امیر نے جو موتی دیے تھے وہ اس کے حکم کے مطابق سعد کے پاس تھے وہ چاروں وہاں دریا کنارے بنی عمارت محل فرضہ کی طرف جہاں بحری تجارتی سامان سے متعلق امور سرانجام دیے جاتے تھے رواں تھے۔

"تم یہاں محصول (کسٹم ڈیوٹی) ادا کرو اور سامان جمع کرواؤ میں ان دونوں کو لیکر جا رہا ہوں۔۔۔" کہاں جا رہا ہوں یہ بتانے کی زحمت خالد افسے نے نہیں کی تھی اور پوچھنے کی زحمت سعد نے نہیں کی۔

"اور یہیں انتظار کرنا۔" وہ کہتا ہوا چلا گیا تھا۔

سعد عمارت کی طرف مڑا جہاں دروازے پر مشعلیں روشن تھیں ۔اندر چھوٹے چھوٹے کئی کمرے تھے جو دیوں کی روشنی میں سنہرے ہوتے تھے۔اسے شاہ بندر سے ملنا تھا یہ متصدی کا نائب تھا۔وہ وہاں اس کے پاس گھوڑوں کا اندراج کرواکر اور محصول ادا کر کے گھوڑوں کو اصطبل میں بند ھوا آیا ۔ اگر گھوڑے اعلی معیار کے ہوتے تو شاہی دربار کا ان پر حق اول ہوتا تھا۔اس کے علاوہ ان کی قیمت بھی متصدی طے کرتا تھا ان کے معیار کے مطابق سوابھی انہیں اس ساری کاروائی ہونے تک کچھ دن انتظار کرنا تھا۔گھوڑوں کی طرح دوسرا سامان بھی پہلے جانچ پڑتال کے مراحل سے گزرتا ان پر محصول ادا کیا جاتا پھر مغل مہر لگا دی جاتی اس کے بعد مغلیہ سلطنت میں وہ کہیں بھی کسی ملک لیکر جاتے تو دوبار محصول ادانہ کرنا پڑتا۔حسان خان نے جو کہ شاہ بندر کے عہدے پر تھا اس سے تمام سامان کا بشمول خالد افسے کے سامان کا محصول لیکر اسے فارغ کیا۔موتیوں کی جانچ میں کافی دیر لگی تھی۔ سفر اور پھر اس سب کاروائی سے اس پر تھکن غالب آنے لگی تھی مگر وہ باہر نکلا تو آنکھیں خیرہ ہوئی تھیں۔۔۔وہ منظر ہی ایسا تھا۔باہر آرائشی تالاب کے کنارے چاروں طرف دیے جل رہے تھے جن کا عکس پانیوں پر پڑتا تھا اور وہاں سے گزرتے لوگ کے سائے بھی عکس ہوتے تھے۔وہاں کونے میں ایک کنول کا پھول تھا۔اس نے اس سے پہلے کبھی کنول کا پھول نہیں دیکھا تھا پاس جا کر دھیرے سے اس کی ہتیوں کو چھوا جس کی جڑیں تالاب میں نیچے تک پھیلی تھی۔عجب الخلقت۔۔۔اس کے ذہن میں آیا۔بندرگاہ پر لوگوں کی بھیڑ اس وقت چھٹ رہی تھی۔وہ وہیں تالاب کے کنارے بنّی پر بیٹھ گیا تھوڑی دیر میں وہ تینوں بھی آگئے تھے۔

وہ پتا کر کے آئے تھے یہاں سے کچھ دور مسافروں کے لیے سرائے تھا۔ایک عجیب سی تکلیف دہ خاموشی ان کے درمیان حائل تھی جس میں وہ چلتے تھے رات کے پہلے پہر جب سفر کی تھکان اور نئی جگہ کی مدہوش اجنبیت غالب تھی۔ تھوڑی دیر بعد ان کے سامنے سرائے کا دروازہ تھا۔یہاں تیس

چالیس چھوٹے مٹی کے کمرے تھے، اچھے حجم کا احاطہ، جانوروں اور سواریوں کے باندھنے کی جگہ ،کنواں اور بالکل مختصر سی مسجد کی جگہ تھی۔

وہ تینوں تو خوب پیٹ بھر چکے تھے سو سونے کے لیے چلے گئے سعد سامنے لگے تنور پر آ گیا۔ تنور کے ساتھ تھوڑی سی جگہ تھی جہاں قالین بچھا تھا اور گاؤ تکیے تھے وہ کھانا خرید کر وہیں بیٹھ گیا تھا۔ابھی روٹی اور بھنے بینگن کا پہلا نوالہ بنایا تھا کہ ایک آدمی اندر داخل ہوا قدرے فربہ سیا،ہ رنگت سر سے پاؤں تک مکمل سفید لباس میں۔ آتے ساتھ وہ اس کے ساتھ گرنے والے انداز میں بیٹھا تھا۔ہاتھ میں جو لکڑی کا بکسا تھا وہ تقریباً پھینکنے والے انداز میں اس نے زمین پر رکھا۔

وہ جو اس کے آنے سے تھوڑا ہڑبڑایا تھا دوبارہ کھانا کھانے لگا۔

"سلام علیک ۔" سعد کے لباس نے اس کی پہچان کروا دی تھی سو اس نے اسے عربی میں ہی مخاطب کیا تھا۔

"وعلیکم سلام۔"

"کچھ نہ پوچھو دوست۔۔۔" اس نے گہری سانس بھری اور اپنی بپتا سنانی شروع کر دی۔

"شکر ہے بچ گیا۔" کہتے ہوئے سعد کے چہرے پر تجسس ڈھونڈا جو کہ ناپید تھا۔

"یہاں آتے ہوئے کنواں نظر نہیں آیا مجھے۔۔۔ تقریباً گرتے گرتے بچا ہوں۔۔۔جب تک کسی کو پتا لگتا موت واقعہ ہو جاتی تھی۔"

سعد کچھ دیر ہاتھ روک کر اس کی بات سنتا رہا۔رد عمل کے طور پر اس کو سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ کیا کہے سو دوبارہ کھانے پر جھک گیا۔

"کہاں سے ہو۔"اس نے اس کی چپ کی پرواہ کیے بغیر سوال کیا تھا۔

"عرب۔" وہ ایک حرفی جواب سے کہاں مطمئین ہونے والا تھا۔

"میرا نام ابو الفضل ہے، میں کابل سے ہوں۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اور تمہارا نام؟"

"سعد الکندری۔"

"میں قندھار سے ہوتا ہوا لاہور اور پھر جانے کہاں کہاں اور پھر یہاں آیا ہوں۔۔۔" یہ غالباً یہاں کھانا کھانے کے لیے آیا ہو گا۔ مگر کھانے کی طرف تو اس کا کوئی دھیان نہیں ہے۔ سعد نے اس کی چرب زبانی سے تنگ آ کر سوچا۔

"اتنا لمبا سفر۔" سعد کو مجبوراً اخلاق نبھانا پڑا۔ اس کا چہرا فخر سے سرخ ہوا تھا اس پل پہلی بار سعد الکندری کو ابو لفضل اچھا لگا۔ اس کے چہرے پر مسکان پھیل گئی۔

اس بار اس نے کچھ نہیں کہا اٹھا اور جا کر کھانا لے آیا اور اس کے سامنے براجمان ہو گیا۔ کھانا ختم کرنے تک وہ سارا نقشہ جہاں جہاں سے وہ ہوتا ہوا آیا تھا اور روداد سفر اسے بتا اور سنا چکا تھا۔

"دیکھو میاں قندھار اگر تم نے کابل سے جانا ہو تو دو راستے ہیں۔" اپنے چوغے سے ایک دھاگہ کھینچ کر دانتوں میں خلال کرتے ہوئے اس نے کہا تھا۔

"ویسے اس سے پہلے میں تمہیں بتا دوں کابل سے کاروان کے راستے دو اطراف میں جاتے ہیں ایک ازبک کی طرف ہندوکش سے ہوتا ہوا بلخ، بخارا، سمرقند، خیوا اور دوسرا قندھار ہند میں اور ہیرات سفاوید میں۔

تو میرے سامنے قندھار پہنچنے کے دو راستے تھے خیبر سے یا ملتان کے پار گومل، سانگھڑ اور سروند سے۔ ملتان والا راستہ چھوٹا تھا مگر صحرا ہونے کے باعث راستے میں تین چار دن پانی موجود نہ ہوتا اس لیے میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ اس کے بعد میں اٹک، امرتسر جہاں ان دنوں جانوروں کا بڑا میلہ لگا ہے اور پھر لاہور سے ہوتا ہوا آ رہا ہوں سارا سامان چار گنا داموں پر بیچ کر۔"

اب ان کے سامنے قہوے کی پیالیاں تھیں۔

"عرب میں کہاں سے ہو بغداد کے قریب ہی نشیمن ہے۔۔۔ خلیج فارس پر۔"

"کعبہ تو دیکھا ہو گا تم نے۔" کہتے ہوئے اس کی آنکھیں ہیرا ہوئی تھیں۔

"نہیں بہت چھوٹا تھا جب والد فوت ہو گئے اس کے بعد پیٹ کے بھرنے کے علاوہ کوئی سوچ نہیں آئی۔" نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگی تھیں وہ وہیں دراز ہو گیا۔ کمرے میں جانے کو ویسے بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔

اتنے میں ایک عجیب سی دھن رات کے اس پہر پھیلی تھی جسے سن کر دل میں کونپلیں کھلنے لگیں، پتوں پر شبنم برف ہو جائے، مہک ٹھہر جائے پھر کہیں نہ جائے۔۔۔ وہ راگ عشق تھا۔

"یہ آواز۔۔۔"

"ہاں شاید کوئی ریاض کر رہا ہے۔" ابوالفضل بھی اس موسیقی سے متاثر ہوا تھا۔

"کیا سامان لائے ہو؟"

"گھوڑے۔" اس نے موتیوں کا ذکر نہیں کیا تھا۔

"اور ساتھی ہیں وہ اپنا سامان لائے ہیں۔۔۔"

"تمہارا جتنا علم ہے لگتا ہے عمر بھر سفر میں رہے ہو۔"

وہ دھن اس کے دل سے گزر رہی تھی اسے بے چین کرتی تھی اوور وہ بھاری ہوتے پپوٹوں کو کھولے ابوالفضل کو دیکھتا تھا۔

"ہنہ تقریباً۔۔۔ ایسا ہی ہے۔" وہ بھی وہیں دراز ہوا تھا کہ اب اس پہر کس نے آنا تھا۔

"صبح بازار مل کر چلیں گے۔ ویسے تم اگر سیدھا شاہی دربار چلے جاؤ تو تمہیں بہترین دام مل سکتے ہیں۔" سعد الکندری نے جواب نہیں دیا تھا وہ نیند کی وادی میں گم ہو چکا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو فجر قضا ہو چکی تھی۔ ابو الفضل وہاں موجود نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر کمرے تک گیا۔ وہ سب اٹھ چکے تھے۔

"آج کیا کرنا ہے؟" خالد اس سے پوچھ رہا تھا۔

"ابھی اصطبل جاؤں گا قیمت لگوانے پھر بازار میں موتی بیچنے کی کوشش کروں گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ مطمئن ہو گیا۔

میں اپنے سامان کے لیے نکلوں گا تم ابھی چلے جاؤ۔۔۔ اسے بھرو۔" اس کو جواب دینے کے بعد اس نے خادم کو حقہ بھرنے کا اشارہ کیا تھا۔

سعد ناشتے کے بعد سرائے سے نکلا تو ابو الفضل بھی پیچھے مٹکتا ڈولتا آیا تھا۔

"میں بھی ساتھ چلوں گا۔"

"میں ابھی بازار نہیں جا رہا اصطبل جا رہا ہوں۔"

"تو میں وہاں بھی ساتھ چلوں گا۔"

وہ مسکرا دیا۔

"ویسے میں تمہیں رات کو کہہ رہا تھا شاہی دربار میں اگر معیاری چیز لیکر جاؤ تو دام سب سے اچھے ملتے ہیں۔"

"ایک تو میں خود تاجر نہیں ہوں کسی نے بھیجا ہے اور پھر پہلی بار آیا ہوں اور اتنے بڑے پیمانے اور معیار کا سامان نہیں ہے۔" وہ سر ہلا کر رہ گیا۔

"گھوڑے بہترین سامان تجارت ہیں یہاں ویسے۔۔۔ یہاں کی حکومت کی طاقت کا سارا دارومدار ہی گھوڑوں پر ہے اس لیے شاہی خزانے میں سے خطیر حصہ ان کی خریداری میں خرچ ہوتی ہے۔" وہ ساتھ چلتے ہوئے حسب عادت اس کی معلومات میں اضافہ کر رہا تھا۔ اب سعد کو برا نہیں لگ رہا

تھا وہ تازہ دم تھا۔

"گھوڑوں کی در آمد ہر سال ایک لاکھ تک پہنچتی ہے جن میں سے صرف چند ہزار گھوڑے شاہی اصطبل کے لیے منتخب کیے جاتے ہیں۔ یعنی سوچو اگر تمہارے گھوڑوں میں سے شاہی دربار کے لیے کچھ منتخب ہو جاتے ہیں تو تم اور گھوڑے کتنے خوش قسمت ہوئے۔" وہ مسکرا دیا۔

"تم یہاں کیا کرنے آئے ہو۔"

"سورت تو میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ یہاں کا بڑا نام سنا تھا سوچا اسے بھی دیکھنا چاہیے ورنہ گوا اور کچھ تو جا چکا ہوں۔ یہاں سے میں ریشم خریدوں گا کابل جا کر بیچوں گا۔"

"گھوڑوں کو بیچنے کے لیے کچھ مشورہ دو گے ۔۔۔ کیا کروں۔"

"تاجر براہ راست شاہی دربار میں گھوڑے فروخت کرتے ہیں یا میلوں میں نیلامی کی جاتی یا علاقے کے بازار میں کوتوال یا صوبیدار کی نگرانی میں بیچے جاتے ہیں۔" تم بھی یہی کرو۔

"ہاہ کیا بتاؤں کن راستوں سے گزر کر آیا ہوں جن راستوں سے ترک اور تزک گھوڑے سفر کرتے ہوئے یہاں کے شہروں میں پہنچتے ہیں۔" وہ صبح کی مہکار میں گہرا سانس بھرتے ہوئے دوبارہ اپنے سفری راستوں کی یاد میں کھو گیا تھا۔ کابل میرا شہر ہند میں داخل ہونے کا دروازہ۔ شمال مغربی سرحد پر یہ تجارتی راستے حفاظتی چوکی کا کام بھی کرتے ہیں۔ تجارتی برادری اور قافلوں کو حفاظت اور عزت دیکر بادشاہ اکبر نے سب کے دل جیت لیے ہیں۔ کہتے ہیں یہ اس کے پُرکھوں کی نصیحت تھی اور وہ صحیح معنوں میں اس کی سلطنت کی طاقت اور شاہی خزانے میں اضافے کا باعث بنے ہیں۔"

"ہنہ تم خاصے متاثر ہو بادشاہ سے۔"

"ہاں متاثر تو ہوں پر عجب متضاد شخصیت ہے اس کی ۔۔۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا ہے۔ آج کل دارالخلافہ لاہور منتقل کیا ہوا ہے وہیں سے پورے ملک کی باگ دوڑ سنبھال رہا ہے۔ شمال مغربی سرحد کو

بھی اس نے وہیں سے قابو کیا ہوا ہے وہاں کی ساری ریاستوں کو متحد کر کے۔ان سے سب سے زیادہ بغاوت کا خطرہ رہتا ہے۔میں انہیں راستوں سے تو ہوتا ہوا آ رہا ہوں۔وہاں حفاظت فراہم کرنے کے لیے تجارتی راستوں پر مقدم اور راہ دار مقرر کیے ہیں۔افغانی قبائل کو معاشی مراعات اور انتظامی عہدے دے کر بدلے میں کارواں کی حفاظت طلب کی ہے۔اس حفاظت کی فراہمی کی وجہ سے سفاوید، مغل اور ازبک میں تجارت کو فروغ ملا ہے۔سڑکیں مزید وسیع کر دی گئی ہیں تاکہ پہیے والی سواریاں آسانی سے چل سکیں، پورے ہندوستان میں میلوں میں گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی نمائش کا اہتمام کیا جاتا ہے۔دہلی، آگرہ ،لاہور تاجروں کی پسندیدہ جگہیں بن چکی ہیں۔ سڑکوں کی تعمیر کے علاوہ حفاظتی چوکیاں، سرائے، پل اور قلعے۔۔کمال کر دیا ہے اس نے۔مگر اس کے ساتھ ہندوؤں پر جو خاص نظر کرم ہے وہ ظاہر ہے بھاتا نہیں ہے، شاہی سکوں پر ان کے بھگوانوں کی مہریں اور ان کو دیے گئے عہدے۔"

سعد الکلندری نے اس پر کوئی رائے پیش نہیں کی تھی۔اس کی خالص مسلمنانیت اور برسوں کی تنہائی میں کبھی کسی اجنبی مذہب کا گزر نہیں ہوا تھا یہ پہلی بار تھا۔اسے نہیں پتا تھا جب کسی اجنبی یا غیر کو ہمارے کسی اپنے سے مراعات ملتی ہیں تو ہمیں برا کیوں لگنا چاہیے۔۔لگنا بھی چاہیے یا نہیں۔



ختم شد

اس قسط پر اپنی رائے کامنٹ باکس میں دیں